4

احباب کو چھوٹی چھوٹی باتوں سے نصیحت حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

(فرمودہ 10 / مارچ 1950ء بمقام ناصر آباد سندھ)

تشہّد، تعوّذ اور سورۃ فاتحہ کی تلاوت کے بعد فرمایا:

''جیسا کہ اُن دوستوں کو معلوم ہوگا جو ''الفضل'' پڑھتے ہیں یا سنتے ہیں اور اس کے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں کہ میں قریباً دو مہینہ سے گلے کی تکلیف سے بیمار ہوں۔ پہلے تو آواز بالکل ہی بند ہوگئی تھی اِس کے بعد آواز کُھلنی شروع ہوئی مگر صرف اِس حد تک کُھلی کہ ایک دو فقرے بولنے کے بعد طبیعت خراب ہو جاتی تھی۔ اِس کے بعد پھر آہستہ آہستہ کچھ اَور آواز کُھلنی شروع ہوئی اور اب اِس حد تک کُھل چکی ہے کہ میں آہستہ آواز سے کچھ دیر تک باتیں کرسکتا ہوں۔ کبھی بیماری کا خیال نہ رہے اور اونچی آواز سے بولنے لگوں تو پھر گلے میں درد شروع ہوجاتی ہے۔ اِس تکلیف کی وجہ سے کچھ عرصہ سے میں نے کوئی خطبہ نہیں پڑھا۔ ربوہ سے چلتے وقت میں نے پہلا خطبہ پڑھا تھا اور اَب دوسرا خطبہ پڑھ رہا ہوں۔ ربوہ میں تو یہ آسانی تھی کہ وہاں لاؤڈ سپیکر تھا اور میری آواز پھیل جاتی تھی لیکن یہاں لاؤڈ سپیکر نہ ہونے کی وجہ سے صرف چند دوستوں تک ہی میری آواز پہنچ سکتی ہے باقی دوستوں تک نہیں پہنچ سکتی۔

بہرحال اب بھی جتنی آواز سے میں بول سکتا ہوں اُتنا بولنے سے بھی بعد میں درد شروع ہو جاتا ہے۔ چنانچہ پچھلے خطبہ کے بعد بھی دو تین دن تک تکلیف زیادہ رہی۔ اِس کے بعد آہستہ آہستہ وہ حالت جاتی رہی۔ ڈاکٹر کہتے ہیں کہ یہ مرض بڑی عمر میں ایک لمبے عرصہ کے بعد اچھی ہوتی ہے۔

اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے کہ یہ مرض کتنا وقت لے گی۔ بظاہر تو یہی بات نظر آتی ہے کہ یہ بیماری لمبا وقت لے گی۔ کیونکہ ذرا بھی مَیں بولوں تو بلغم بار بار گلے میں پھنستا ہے اور گلے میں سے بلغم کو نکالنا پڑتا ہے۔ بعض دفعہ بلغم نہیں نکلتا تو خراش رہتی ہے اور بار بار کھانسنا پڑتا ہے۔ بہرحال جہاں تک میرے گلے میں طاقت ہے اور میں خطبہ پڑھ سکتا ہوں میں نے یہی ارادہ کیا کہ خود خطبہ پڑھوں گو وہ مختصر ہی کیوں نہ ہو۔ اور درحقیقت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں تو مختصر خطبہ ہی پڑھا جاتا تھا۔ حدیثوں میں آتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا خطبہ بعض دفعہ نماز سے آدھا ہوتا تھا۔ یعنی اگر نماز پڑھنے میں دس منٹ صَرف ہوتے تھے تو خطبہ پانچ منٹ میں ختم ہو جاتا تھا۔ کیونکہ اُس زمانہ میں لوگ چھوٹی چھوٹی باتوں کو سمجھ لیتے تھے لیکن اِس زمانہ میں جب تک مغز ماری نہ کی جائے لوگ بات کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے۔ جو باتیں آجکل لمبی لمبی تقریروں سے حاصل کی جاتی ہیں وہ کسی زمانہ میں محض ایک دو مثالوں سے حاصل کر لی جاتی تھیں یا اپنے بزرگوں کے بتائے ہوئے ایک دو فقرے سن کر ہی لوگ نصیحت حاصل کر لیتے تھے کیونکہ اُس زمانہ میں لوگ حقیقت پر عمل کرنے کی کوشش کرتے تھے مگر آجکل جذبات سے کھیلنے کی کوشش کی جاتی ہے اور جذبات ابھارنے کے لئے لمبے وقت کی ضرورت ہوتی ہے۔ پہلے ایک مقرر تمہید باندھتا ہے اور اس میں ایسی باتیں بیان کرنی شروع کرتا ہے جو لوگوں کے مسلّمات میں سے ہوتی ہیں اور جن کو وہ مدت سے صحیح تسلیم کرتے چلے آرہے ہوتے ہیں۔ پھر اُن مسلّمات پر وہ اس بات کی بنیاد رکھ کر اسے پیش کرتا ہے تاکہ وہ ان مسلّمات کے ساتھ ان کے دماغ میں گھس جائے۔ اور جب وہ کسی بات کو ایسی شکل میں پیش کر دیتا ہے کہ سننے والے اسے مان سکیں تو پھر وہ اس بات کی طرف ان کے دماغوں کو پھراتا ہے کہ اس کے بغیر ان کا گزارہ ہی نہیں۔ اور یہ کہ اگر انہوں نے وہ بات نہ مانی تو ان پر تباہی آجائے گی۔ اس طرح وہ ان کے جذبات کو ابھار دیتا ہے اور ایک لمبی تقریر کے بعد وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوتا ہے۔ لیکن چونکہ جذبات کا ابھارنا عقل کو کمزور کر دیتا ہے اس لئے بسا اوقات یہ طریق ایسے لوگ بھی اختیار کر لیتے ہیں جو سچائی کی خدمت کرنا نہیں چاہتے بلکہ جھوٹ کو پھیلانا چاہتے ہیں۔ جس طرح ایک ننگی دوائی جس پر کوئی اَور چیز چڑھی ہوئی نہ ہو اُس کے متعلق ہر کھانے والا یہ معلوم کر سکتا ہے کہ وہ کڑوی ہے یا کھٹی ہے یا میٹھی ہے یا بدبودار ہے یا خوشبودار ہے۔ لیکن اگر اس پر کھانڈ چڑھی ہوئی ہو تو کھٹی بھی میٹھی معلوم ہوگی اور کڑوی بھی میٹھی معلوم ہوگی اور

میٹھی بھی میٹھی معلوم ہوگی اور پھیکی بھی میٹھی معلوم ہوگی۔ اسی طرح جب جذبات کو ساتھ ملا دیا جاتا ہے تو سچ بھی جوش دلا دیتا ہے اور جھوٹ بھی جوش دلا دیتا ہے اور انصاف کے نام پر بھی لوگ ابھار دیئے جاتے ہیں اور ظلم کی مدد کے لئے بھی لوگ ابھار دیئے جاتے ہیں۔

پس اصل طریق تو وہی ہے جو پہلے زمانوں میں رائج تھا کہ مختصر بات بیان کی جائے اور اس میں حقیقت کو لوگوں کے سامنے واضح کر دیا جائے۔ آخر کسی چیز کی سچائی کے کوئی ذاتی دلائل بھی تو ہوتے ہیں یہ تو ضروری نہیں کہ سچائی کو ہمیشہ انسانی جذبات کے ساتھ ملا کر ہم لوگوں کے سامنے لائیں۔ مثلاً اسلام توحید پیش کرتا ہے اور توحید اپنی ذات میں ثابت بھی کی جا سکتی ہے اور اس کی تردید بھی کی جا سکتی ہے۔ اگر توحید کی تائید میں کہا جاتا ہے کہ بتوں میں کوئی طاقت نہیں اور وہ کسی انسان کو کوئی فائدہ یا نقصان نہیں پہنچا سکتے تو ایک انسان جو بت پرست ہو یہ بھی پیش کر سکتا ہے کہ بتوں میں فلاں فلاں خوبی موجود ہے۔ اور اگر خدا تعالیٰ کی وحدانیت کے ثبوت میں ہم یہ بات پیش کر سکتے ہیں کہ تمام قانونِ قدرت ایک خدا پر دلالت کرتا ہے جیسے قرآن کریم نے بھی یہ بات پیش کی ہے اور فرمایا ہے کہ کیا تمہیں دنیا میں کہیں بھی دو قانون نظر آتے ہیں؟ اگر دو قانون ہوتے تو تم سمجھ سکتے تھے کہ خدا ایک نہیں۔ لیکن جب تمام عالَم میں ایک ہی قانون نظر آتا ہے تو اس کے صاف معنے یہ ہیں کہ ایک ہی خدا ہے دو نہیں۔ یہ ایک دلیل ہے جسے توحید باری تعالیٰ کے ثبوت میں پیش کیا گیا ہے۔ اب مقابل کا فریق اگر اُس کے لئے ممکن ہو تو یہ دلیل پیش کر سکتا ہے کہ دنیا میں ایک قانون نہیں بلکہ کسی جگہ کوئی قانون کام کرتا ہے اور کسی جگہ کوئی۔ یا مثلاً جس طرح ایک خدا پرست انسان یہ کہہ دیتا ہے کہ میرا خدا تعالیٰ سے تعلق ہے اور وہ مجھ سے باتیں کرتا ہے اور میری دعائیں سنتا ہے اسی طرح ایک بت پرست بھی حق رکھتا ہے کہ وہ اپنے میں سے کسی آدمی کو پیش کر دے اور کہے کہ اس سے فلاں بت نے باتیں کی ہیں یا اس کی دعائیں اس نے سنی ہیں۔ یہ دلائل کا طریق ہے یعنی شرک بھی موجود ہے اور توحید بھی موجود ہے۔ شرک کی تائید کرنے والے نے بھی دلیل دے دی اور توحید کی تائید کرنے والے نے بھی دلیل دے دی۔ اب سننے والے خود بخود فیصلہ کر سکتے ہیں کہ دنیا کے ایک قانون سے ایک خدا ثابت ہوتا ہے یا دو خدا ثابت ہوتے ہیں یا وہ فیصلہ کر سکتے ہیں کہ ایک قانون موجود نہیں بلکہ دو قانون موجود ہیں۔ بہرحال دو باتوں سے ایک بات ضرور ہوگی یا تو وہ فیصلہ کر لیں گے کہ دنیا کا ایک قانون ثابت کرتا ہے کہ ایک خدا ہے اور یا یہ فیصلہ کر لیں

گے کہ ایک سے زیادہ قانون ہیں۔ اسی طرح لوگ یا تو یہ فیصلہ کر لیں گے کہ بتوں نے بھی لوگوں کی دعائیں سنی ہیں اور اپنے ماننے والوں کی تائید کی ہے اور یا وہ یہ فیصلہ کر لیں گے کہ بتوں میں کوئی طاقت نہیں کہ وہ کسی کی مدد کر سکتے ہیں اور نہ کسی کو نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ مگر یہ عقلی طریق ہے جس کی دلائل پر بنیاد رکھی جاتی ہے۔ اور جذباتی طریق یہ ہوتا ہے کہ ایک بت پرست کھڑا ہو جاتا ہے اور کہتا ہے سنو! یہ توحید کے پرستار کیا کہتے ہیں۔ یہ کہتے ہیں تمہارے باپ دادا اُلّو تھے تمہارے باپ دادا گدھے تھے، تمہارے باپ دادا بڑے بڑے خبیث تھے جو بتوں کے آگے سر جھکاتے رہے اب کون یہ شخص ماننے کے لئے تیار ہوگا کہ میرے باپ دادا واقع میں اُلّو تھے یا گدھے تھے یا خبیث اور ناپاک انسان تھے۔ آخر کافر کو بھی اپنے ماں باپ سے محبت ہوتی ہے اور وہ یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ انہیں برا بھلا کہا جائے۔ جب وہ ان کے سامنے شرک کو اس رنگ میں پیش کرتا ہے کہ تمہارے باپ دادا اسے مانتے تھے اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ وہ بڑے اُلّو تھے، بڑے احمق تھے، بڑے خبیث اور بے ایمان تھے۔ وہ جانتے تھے کہ ان بتوں میں کوئی طاقت نہیں مگر پھر بھی وہ فریب سے کام لے کر ان کے آگے اپنا سر جھکا دیتے تھے۔ تو لوگوں میں جوش پیدا ہو جاتا ہے اور وہ کہتے ہیں کہ ہم اس کی بات کیوں مانیں یہ تو ہمارے باپ دادا کو اُلّو قرار دیتا ہے یہ تو انہیں احمق اور گدھا قرار دیتا ہے گویا دلیل غائب ہوگئی۔ ایک قانون کی موجودگی کا کوئی سوال ہی نہ رہا بلکہ سوال یہ آ گیا کہ یہ ہمارے باپ دادا کو اُلّو کہتا ہے، یہ انہیں احمق اور گدھا کہتا ہے، یہ اعلان کرتا ہے کہ جو شخص ایک خدا کو چھوڑ کر بتوں کے آگے سر جھکاتا ہے وہ بیوقوف ہے اور بےوقوف گدھا ہوتا ہے۔ پس اس کے معنے یہ ہیں کہ یہ ہمیں اور ہمارے باپ دادا کو گدھا قرار دیتا ہے۔ یہ کہتا ہے کہ جو شخص سچائی کے خلاف کام کرے وہ بے ایمان ہوتا ہے اور پھر یہ کہتا ہے کہ توحید سب سے بڑی سچائی ہے۔ جب توحید سچائی ہوئی تو جو اس سچائی کے خلاف چلتا ہے وہ بے ایمان ہے۔ گویا دوسرے لفظوں میں اس کے یہ معنے ہیں کہ ہمارے باپ دادا بے ایمان تھے۔ اور جو بے ایمان ہو وہ خبیث بھی ہوتا ہے اور زندیق بھی ہوتا ہے۔ اب یہ لازمی بات ہے کہ جب بات کو اس رنگ میں پیش کیا جائے گا تو دلیل غائب ہو جائے گی اور یہ لوگ کہنا شروع کر دیں گے کہ انہیں مار ڈالو، انہیں قتل کر دو، ان کا مال و اسباب چھین لو، انہیں ملک سے نکال دو کیونکہ یہ ہمارے باپ دادا کو احمق گدھا بے ایمان اور خبیث قرار دیتے ہیں۔ غرض جب کسی بات کے ساتھ جذبات مل جاتے ہیں تو دلیل کمزور ہو جاتی ہے۔

لیکن جب جذبات سے علیحدہ کر کے کسی بات کو پیش کیا جائے تب پتہ لگتا ہے کہ اس میں کتنا وزن ہے اور وہ معقول ہے یا غیر معقول مثلاً یہ جذباتی طریق ہی تھا کہ جب حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام فوت ہو چکے ہیں تو چونکہ دنیا کہتی تھی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام زندہ ہیں اس لئے مولویوں نے شور مچا دیا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ہتک کی جاتی ہے اور خدا کے نبی کی ہتک کی جاتی ہے، خدا کے رسول کی ہتک کی جاتی ہے۔ اب یہ لازمی بات تھی کہ لوگ اِس سے مشتعل ہو جاتے تھے۔ جب انسان اپنے ماں باپ کی ہتک بھی برداشت نہیں کر سکتا تو خدا تعالیٰ کے نبی اور رسول کی ہتک کس طرح برداشت کر سکتا ہے۔ چنانچہ وہ مشتعل ہوئے اور اُنہوں نے احمدیت کی مخالفت شروع کر دی۔ مگر آہستہ آہستہ اُن کے کانوں میں اِس امر کے دلائل پڑنے شروع ہوئے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام فوت ہو چکے ہیں۔ اُنہوں نے لڑائیاں بھی کیں، انہوں نے کفر کے فتوے بھی لگائے مگر جب وہ گالیاں دینے اور لڑائیاں کرنے اور کفر کے فتوے لگانے کے بعد اپنے گھروں میں واپس آئے تو اُن کے دلوں سے یہ آواز اُٹھتی کہ سچی بات تو یہی معلوم ہوتی ہے کہ عیسیٰ مر گیا ہے۔ انہوں نے اِس مسئلہ کی وجہ سے ہماری جماعت کے لوگوں کو مارا بھی، انہیں پیٹا بھی، انہیں بُرا بھلا بھی کہا مگر جب وہ غور کرتے تو اُن دلائل کی وجہ سے جو متواتر اُن کے کانوں میں پڑتے جا رہے تھے وہ سمجھتے کہ بات تو یہی دل کو لگتی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام فوت ہو گئے ہیں۔ پھر آہستہ آہستہ اِس رَو نے اَور ترقی کرنا شروع کیا اور پہلے ایک نے پھر دوسرے نے پھر تیسرے نے اور پھر چوتھے نے اپنی زبان سے بھی یہ کہنا شروع کر دیا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام فوت ہو گئے ہیں۔ اُدھر انگریزی تعلیم کا لوگوں میں رواج ہوتا چلا گیا اور اس تعلیم کے نتیجہ میں بھی آئندہ نسلوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ یہ لغو اور بیہودہ قصے ہیں ہم اِن کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں۔ بلکہ تعلیم یافتہ آدمی تو آسمان کو ہی نہیں مانتا۔ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے آسمان پر بیٹھنے کو کہاں تسلیم کر سکتا ہے۔ وہ تو سمجھتا ہے کہ آسمان فضا کا نام ہے کسی خاص جگہ کا نام نہیں جہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام بیٹھے ہوئے ہوں۔ جب وہ آسمان کا ہی قائل نہ رہا تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زندگی کو وہ کس طرح تسلیم کر سکتا تھا۔ گویا اِدھر دلائل نے اور اُدھر موجودہ زمانہ کی تعلیم نے اُن خیالات کو پلٹ دیا جو لوگوں کے دلوں میں پائے جاتے تھے۔ چنانچہ ہر کالج اور سکول کا لڑکا قطع نظر اِس سے کہ وہ احمدیت کی تعلیم کو مانتا تھا یا نہیں۔ یا حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے

دعاوی کا اُسے علم تھا یا نہیں مغربی تعلیم کے اثر کے نیچے کالج اور سکول سے یہ عقیدہ لے کر نکلا کہ یہ کوئی معقول بات نہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام آسمان پر زندہ بیٹھے ہوئے ہیں۔اور اِس طرح وہ ایک ایسے نقطۂ نگاہ سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات کا قائل ہو گیا جس کا قرآن کریم سے تعلق نہیں تھا صرف سائنس سے تعلق تھا یا فکر کے ساتھ اُس کا تعلق تھا۔ چنانچہ جب ایسے شخص سے کہا جائے کہ قرآن کریم میں لکھا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام زندہ ہیں تو وہ فوراً یہ جواب دیتا ہے کہ ایسے قرآن کو اپنے گھر رکھو مَیں اِن باتوں کا قائل نہیں۔ اِس کے مقابلہ میں ایک احمدی بھی یہی عقیدہ رکھتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام فوت ہو چکے ہیں۔لیکن ایک احمدی میں اور مغربی تعلیم کے اثر کے نیچے وفاتِ مسیحؑ کا قائل ہونے والے میں بہت بڑا فرق ہوتا ہے۔ جب دوسرے شخص سے کوئی کہتا ہے کہ قرآن میں لکھا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام زندہ ہیں تو وہ کہتا ہے مَیں ایسے قرآن کو ماننے کے لئے تیار نہیں۔ بات یہی ہے کہ وہ فوت ہو چکے ہیں اور یہ عقیدہ رکھنا کہ وہ آسمان پر زندہ بیٹھے ہیں موجودہ سائنس کے بالکل خلاف ہے۔لیکن جب ایک احمدی سے یہ کہا جائے کہ قرآن کریم میں لکھا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام زندہ ہیں تو وہ کہتا ہے یہ بالکل جھوٹ ہے۔قرآن سچا ہے،قرآن کی ایک ایک بات سچی ہے اور اس میں یہی لکھا ہوا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام فوت ہو چکے ہیں۔

غرض دونوں کہتے ایک ہی بات ہیں مگر ہماری جماعت کے افراد قرآن کریم کو سچا سمجھتے ہوئے یہ عقیدہ رکھتے ہیں اور وہ قرآن کریم کو چھوڑ کر یہ عقیدہ رکھتے ہیں۔ بہرحال جب مسلمانوں میں تعلیم پھیلی تو اِس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آہستہ آہستہ اُنہوں نے بھی کہنا شروع کر دیا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام فوت ہوگئے ہیں۔اب جب مولویوں نے دیکھا کہ مسلمانوں نے خود یہ کہنا شروع کر دیا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ فوت ہو چکے ہیں تو اُنہوں نے صحیح فیصلہ کیا کہ اب ہمیں اَور طرح ان کے جذبات سے کھیلنا چاہیے۔یہی بات بتاتی ہے کہ اُن کی بنیاد دلائل اور عقل پر نہیں تھی بلکہ جذبات پر تھی۔ اگر دلائل اور عقل پر بنیاد ہوتی تو جب اُنہوں نے یہ دیکھا تھا کہ مسلمانوں نے اب خود ہی یہ کہنا شروع کر دیا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام فوت ہو چکے ہیں تو وہ کہتے ہم سے غلطی ہوگئی تھی۔لیکن ان کی غرض تو جذبات سے کھیلنا تھی اُنہوں نے اب ایک اَور رنگ میں لوگوں کے جذبات سے کھیلنا شروع کر دیا اور یہ کہنے لگے عیسیٰ مر گیا ہو یا نہ مرا ہو مرزا صاحب تو یہ کہتے ہیں کہ مَیں خدا کا نبی ہوں اور ہم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کے بعد کسی نبی کو تسلیم نہیں کر سکتے۔ پھر اُنہوں نے لوگوں کو بار بار یہ کہہ کر اشتعال دلانا شروع کر دیا کہ ارے لوگو! یہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ایک اَور نبی مانتے ہیں۔ اب یہ صاف بات ہے کہ جب یہ کہا جائے گا کہ فلاں جماعت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ایک شخص کو نبی ماننے لگ گئی ہے تو عام طور پر اِس کے یہ معنی سمجھے جائیں گے کہ گویا اُن کے نزدیک محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت ختم ہوگئی ہے۔ اور یہ ایک ایسی چیز ہے جو مسلمانوں کو مشتعل کرنے کے لئے کافی ہے۔ چنانچہ انہوں نے پھر دوبارہ لوگوں کے جذبات سے کھیلنا شروع کر دیا اور چاہا کہ وہ اِسی رَو میں بہتے چلے جائیں اور کبھی سنجیدگی کے ساتھ حقیقت پر غور کرنے کی کوشش نہ کریں۔

غرض اِس زمانہ میں عام طور پر لوگ جذبات سے کھیلنے لگ گئے ہیں۔ سچائی پر پردہ ڈال دیتے ہیں۔ ایسے رنگ میں اپنی بات کو چکر دیتے ہیں کہ اُس کی شکل اَور بن جاتی ہے اور حقیقت اَور ہوتی ہے۔ اِس نقص کو دیکھتے ہوئے اور لوگوں کے دماغوں کی کیفیت کو مدنظر رکھتے ہوئے اب سچ کے لئے بھی اِسی حربہ سے کام لینا ضروری ہو گیا ہے اور ہمارے لئے بھی اِس کے بغیر چارہ نہیں رہا۔ جیسے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ آگ سے کسی کو عذاب دینا جائز نہیں۔1 اِس حکم کے مطابق بندوق اور توپ وغیرہ کا استعمال مسلمانوں کے لئے جائز نہیں۔ لیکن اِس زمانہ میں چونکہ دشمن اِن چیزوں کو استعمال کرتا ہے اور اگر مسلمان اِن چیزوں کو استعمال نہ کریں تو وہ شکست کھا جائیں اِس لئے ہم کہیں گے کہ اصل حکم تو یہی ہے کہ آگ سے کسی کو عذاب نہ دیا جائے۔ لیکن جب دشمن ابتدا کر دے اور وہ اِن چیزوں کا استعمال کرے تو پھر مسلمانوں کے لئے بھی بندوق اور توپ اور دوسرے آتشیں اسلحہ کا استعمال جائز ہو جائے گا۔ یا جیسے کسی انسان کی آزادی کو چھیننا جائز نہیں۔ لیکن اگر دشمن ہمارے آدمیوں کو غلام بنالے تو پھر ہمیں بھی اُن کے آدمیوں کو غلام بنانا پڑے گا۔ اور ہماری یہ کارروائی جو جوابی رنگ رکھتی ہوگی ہمارے لئے جائز ہو جائے گی۔ یا مثلاً جنگ کرنا جائز نہیں۔ لیکن اگر دشمن جنگ شروع کر دے تو پھر ہمارے لئے بھی اُس سے لڑائی کرنا جائز ہو جائے گا۔

پس زمانہ کے حالات کے مطابق گو جوابی طور پر ہمیں بھی لمبی تقریریں کرنی پڑتی ہیں مگر میرے گلے کی جو موجودہ حالت ہے وہ اِس جوابی طریق کے اختیار کرنے کی بھی اجازت نہیں دیتی۔ شاید اللہ تعالیٰ ہمارے سلسلہ کے دوستوں کو اِس بات کی عادت ڈالنا چاہتا ہے کہ وہ چھوٹی چھوٹی باتوں سے نصیحت

حاصل کرنے کی کوشش کیا کریں۔ بہرحال لمبے خطبے سنت نہیں ہیں۔ سنت یہی ہے کہ مختصر خطبہ ہو۔ جیسے میں نے بتایا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم بعض دفعہ اِتنا مختصر خطبہ پڑھتے تھے کہ وہ جمعہ کی نماز سے بھی چھوٹا ہوتا تھا۔ بعض دفعہ آپ نے لمبے لمبے وعظ بھی کئے ہیں۔ یہاں تک کہ ایک آپ نے اِتنا لمبا وعظ کیا کہ ظہر سے عشاء کی نماز تک بلکہ اُس کے بعد بھی جاری رہا۔2 پس لمبا وعظ بھی ہوتا تھا یہ نہیں کہ کبھی نہیں ہوتا تھا لیکن عام طور پر مختصر تقریر ہوتی تھی۔ اگر مختصر تقریریں نہ ہوتیں تو اِتنی حدیثیں لوگوں کو کس طرح یاد ہوتیں۔ مثلاً میرے خطبات کو ہی لے لو۔ کیا کوئی شخص اُنہیں یاد رکھ سکتا ہے؟ یاد رکھنے کے لئے مختصر کلام کی ضرورت ہوتی ہے۔ اِس لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم مختصر خطبہ پڑھا کرتے تھے ورنہ لمبے خطبات کی صورت میں تو حدیثیں بن ہی نہیں سکتی تھیں۔''

(الفضل یکم اپریل 1950ء)

1: صحیح بخاری کتاب الجِهَاد و السِّیَر باب لَا یُعَذَّبُ بِعَذَابِ اللّٰہِ ....

2: صحیح مسلم کتاب الفتن و اشراط الساعۃ باب اخبار النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم فی ما یکون الیٰ قیام الساعۃ میں فجر کے بعد سے لے کر سورج غروب ہونے تک خطاب کا ذکر ہے۔